Date of Publication: 23-06-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 June 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

یکم تا ۷؍جولائی ۲۰۱۳ء	1-7 July 2013
شمارہ نمبر: ۲۵، جلد نمبر: ۷۲	Issue: 25, Vol.: 72

یوں تو جو بہت بچی وہ پرانی ہوئی، لیکن وقت اور فاصلہ دو ایسی چیزیں ہیں جن کی آئندہ اور گزشتہ کے لحاظ سے کوئی حد ہی نہیں ہے۔ پرانے ہندستان کی قدامت کا تصور بھی وقت ہی کی طرح بے پایاں اور مبہم ہے، کیوں کہ یہ کوئی چند صدیوں کی بات نہیں ہے۔ اس قدامت کا کچھ اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ بعض ماہرین کے نزدیک پہلا انسان اسی سرزمین پر نمودار ہوا تھا۔

ویدوں کے زمانے کو قدامت کے لحاظ سے جو ترتیب حاصل تھا وہ موہن جودڑو اور ہڑپا کی کھدائی سے جاتا رہا۔ ویدوں کا زمانہ نسبتاً جدید ہو گیا اور علم انسانی کو ایک اور قدیم تر تمدن سے آگہی ہوئی۔ ان دونوں زمانوں کے دوائر کی ہم آہنگی کے متعلق ابھی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔

نسلی امتیاز کی وجہ سے وہ قدیم باشندوں سے برتر تھے اور انھیں خود بھی اس بات کا احساس تھا، چناں چہ اس احساس کا اظہار ویدوں کے اُس قدیم ترین ہندستانی ادب میں ہے جنھیں انھوں نے ترتیب دیا۔ اتھرووید میں ایک جگہ لکھا ہے:

"میں نگران ہوں۔ میرا نام بڑا، اس دھرتی پر جیتنے والا، ہر چیز کو جیتنے والا، اس کے ہر حصے کو پورے طور پر قابو میں لانے والا"۔

گویا زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے پورے ہندستان کے ادب کی پہلی آواز فاتحانہ جذبات و احساسات کی حامل تھی۔ ہر شخص کے لیے کام تھا، ہر شخص ضروریاتِ زندگی کے لیے صرف اپنی ہی قوتِ بازو کا محتاج تھا، ہر شخص مطمئن تھا اور حال میں مست۔ اسے آئندہ اور گزشتہ کی کوئی سوچ نہ تھی۔ اس کا ماضی

ماضی کے جھروکے سے

پہلی قسط

پرانے ہندستان کا ایک شاعر: امارو

میراجی

آریاؤں اور سندھ کے تمدن میں کوئی باہمی تعلق تھا یا نہیں، یہ ابھی ایک پُراسرار مسئلہ ہے۔ البتہ ایک بات ظاہر ہے کہ وادیِ سندھ کے مردوں اور عورتوں کی تخلیقات کے اثرات مشرق میں ملتان، پنجاب اور راجپوتانہ اور مغرب میں ایران، ایشیائے کوچک بلکہ مصر تک ملتے ہیں۔ ان اثرات کی وضاحت کے لیے ابھی ہمیں اور انتظار کرنا ہوگا، لیکن گمانِ غالب ہے کہ مستقبل کے ماہرین یہ ثابت کر دیں گے کہ ان قدیم سندھیوں اور آریاؤں میں باہم تمدنی تعلقات تھے۔ اگر یہ بات ثابت ہو گئی تو آریاؤں کی قدامت اور بڑھ جائے گی اور ہندستان کی تہذیب آریا، یونانی اور مغل اثرات کا مجموعہ ہونے کی بجائے ایک ایسی خود رو تہذیب ہو جائے گی جس پر ماضی میں آئے دن نئے اثرات ہوتے رہے۔

آریا باہر سے آئے تھے۔ شمالی پہاڑوں کو پار کر کے ان کے سامنے ایک ایسی نئی سرزمین پھیلی ہوئی تھی جس پر قابو پانا اور جس کے رہنے والوں کو مفتوح بنانا اُن کا پہلا مقصدِ حیات تھا۔ جسمانی اور خوشگوار نہ تھا اور بیتے ہوئے زمانے کی تلخی کو وہ اس نئی سرزمین کے زندگی بخش اثرات میں بھلا رہا تھا، اور اُس کا مستقبل ابھی ایک بہت دور کی بات تھا۔ ویدوں کی شاعری سے اسی فلسفۂ حیات کا اظہار ہوتا ہے جو حال میں مگن اور مصروف رہنے والے لوگوں کے اندازِ نظر سے بنا ہو۔ اس حیات پرور زمین کو دیکھ کر ان کے دل میں ستائش کے جذبات پیدا ہوتے تھے اور وہ اپنی اور قدرت کی تعریف کرتے تھے، لیکن انھیں اپنے فطری اور خداداد زور اور بل کو قائم رکھنے اور بڑھانے کی بھی ضرورت تھی۔ انھیں ایک ایسی شکتی کی ضرورت تھی جو انھیں اندیشۂ فردا سے بے نیاز کر دے، چناں چہ رگ وید کا ادب ایک ایسی ہی شکتی کی جستجو کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں اگنی کی برتری کے گن گائے گئے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے ارتقا کے لیے آگ کی ضرورت تھی۔ آگ کی دریافت انسان کی کشمکشِ حیات کا پہلا باب ہے۔ رگ وید اسی زمانے اور اسی کشمکش کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ابتدائی الجھنیں رفتہ رفتہ ختم ہو گئیں، یہاں تک کہ ہندستان میں انسان کی تخلیقی کارفرمائیوں نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ جب انسان نے آگ پر قابو پا لیا تو وہ اس نئی اور اندھی شکتی سے جن باتوں کا متقاضی ہوا اُن کا ذرا سا بیان سنیے:

"جلا دے اے اگنی، قریب ترین دشمنوں کو، جلا دے دور کے بدخواہوں کو، ان دکھوں کو جلا دے۔ تیرے ہر دم نئے، ان تھک شعلے پھیلتے ہی جائیں۔ جو تیرے لیے جان مارتے ہیں انھیں اندھا زور دے، انھیں خوش بختی دے اور خوش حالی، اے اگنی!" (رگ وید)

لیکن سونے جاگنے اور کھانے پینے پر ہی انسانی ضروریات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، چناں چہ ویدوں کے اُرواسی کے فسانے میں محبت کا رومان بھی موجود ہے، جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی عورت ایسی ہی خصوصیات رکھتی تھی جیسی آج رکھتی ہے، صرف زمانے کے اثرات کا فرق ہے۔

آریا تنومند تھے، چوڑے چکلے جسموں والے، اچھے ہاضم معدوں والے، کڑے، سخت، جنگ میں چابک دست، اور بہادر اور اسی لیے وہ بہت جلد شمالی ہندستان پر قابض ہو گئے۔ تیر کمان اُن کا ہتھیار تھا اور وہ رتھوں میں نیزوں کے ساتھ دشمن پر حملہ کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے دریائے سندھ اور گنگا کے ساتھ ساتھ مشرق اور جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے دریائے نربدا تک قبضہ جما لیا۔

جوں جوں اُن کی فتوحات مکمل ہوتی گئیں اور جنگی ضروریات کم، وہ اطمینان کے ساتھ مختلف علاقوں میں قائم ہو کر زراعت پیشہ بنتے گئے اور ان کے قبیلے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل ہونے لگے۔ ہر ریاست پر ایک مہاراجا حکومت کرتا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں وہ حکومت کے نشے میں اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کر جائے، اُس کے مشیر کار کی حیثیت سے فوجی سرداروں کی ایک کمیٹی ہوتی تھی۔ ہر قبیلے کا حاکم راجا ہوتا تھا اور پھر اُس کی بھی ایک چھوٹی کمیٹی۔ اور ہر گاؤں میں مختلف گھرانوں کے بڑے بوڑھے ہر طرح کا انتظام اور فیصلہ کرتے تھے۔ ان فیصلوں کے لیے سارا گاؤں چوپال میں اکٹھا ہوتا تھا۔ مہابھارت کے ایک مکالمے میں لکھا ہے: "جب تک وہ یوں اکٹھے ہوا کریں گے اور اپنی سماج کی جماعت بندی میں حصہ لیتے رہیں گے، انھیں زوال نہ آئے گا اور وہ خوش حال ہوں گے اور ترقی پائیں گے"۔

آریاؤں کو اس نئی سرزمین میں اطمینان و فراغت کے ساتھ مختلف علاقوں میں آباد ہو جانے پر ایک اور خطرہ بھی لاحق ہوا اور وہ یہ کہ یہاں کے پہلے باشندوں سے ان کے اپنے لوگ شادی بیاہ کے تعلقات قائم نہ کر لیں، کیوں کہ اس طرح انھیں اپنے نسلی امتیاز کے کھوئے جانے کا اندیشہ تھا، اس لیے انھوں نے شادی پر پابندی رکھنے کے لیے سماجی اصول بنائے۔ ان اصولوں کا مقصد یہ تھا کہ نسلیں کہیں پچھلی ناگوں سے علاحدہ رہیں۔ یہ پابندی اگرچہ نسل کو دوغلا ہونے سے بچانے کے لیے تھی، لیکن آگے چل کر اسی سے ذاتوں کی تقسیم

عمل میں آئی۔

ویدوں کے زمانے میں شادی بیاہ پر تو پابندی تھی، لیکن ذات پات کے بندھن کوئی نہ تھے۔ ان بندھنوں کے لیے ہندوستان ان برہمنوں کا ممنون ہے جنھوں نے منو سے لے کر آئندہ ہر زمانے میں اپنے فرقے کی طاقت کو بڑھانے کے لیے مساوات کے اصول کو بھلا دیا۔ جب ویدوں کا زمانہ ختم ہوا اور مہابھارت اور رامائن کا دور آیا تو ذات پات کا جال سخت ہونے لگا اور پیشے روز بروز وراثتی حیثیت اختیار کرتے گئے۔ ابھی تک چوں کہ برہمنوں ہی کو مطالعے کا حق اور فرصت حاصل تھی اس لیے وہی ادب کے بانی ہوئے، اور شروع میں شاعری بھی مذہبی رنگ ہی لیے رہی۔ ذات پات کے بندھن تو سخت ہوئے لیکن رامائن اور مہابھارت کے زمانے میں بھی برہمنوں کو کوئی امتیازی درجہ حاصل نہ تھا، وہ صرف کل انسانوں کے ایک گروہ ہی کو ظاہر کرتے تھے، بلکہ رامائن میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ ایک کشتری کا درجہ برہمن سے بڑھ کر ہے۔ جنھوں نے بھی خود بخود کشتریوں کو سب سے اعلا سمجھنا اور کہنا شروع کر دیا، اور بدھ لٹریچر میں تو برہمن کو نیچ بھی لکھا ہے۔

جنگ اور فتوحات کا دور ختم ہوا اور آریا امن کے ساتھ رہنے لگے؛ اور مذہب، جس کا تصور ذہن انسانی میں دراصل معاملات کے لیے قدرت کے رحم و غضب کو قابو میں رکھنے کے واسطے پیدا ہوا تھا، پہلے سے پیچیدہ ہوتا گیا اور اس بات کی ضرورت پیدا ہوئی کہ انسان اور دیوتاؤں کے تعلق کو استوار بنانے اور احسن طریق پر نبھانے کے لیے مخصوص اور ماہر لوگ مقرر ہوں۔ چناں چہ اسی ضرورت کی بنا پر برہمن کثرت، دولت اور طاقت میں روز افزوں ترقی کرنے لگے، لیکن بدھ کے زمانے تک کشتریوں نے ذہنی برتری کا اجارہ کلیتاً برہمنوں کو نہیں دے دیا تھا۔ ویش لوگ بھی باقاعدہ صورت میں بدھ کے زمانے کے بعد ہی سے ظہور میں آئے اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کے قدیم باشندے شودر کہلانے لگے۔

ان آریاؤں کے رہن سہن کا طریقہ کیا تھا؟ پہلے جنگ، پھر گلہ بانی اور زراعت، پھر دست کاری۔ ہندوستانی آریا گایوں کو پالتے اور پرورش کرتے تھے لیکن ابھی اس جانور کو وہ مقدس رتبہ حاصل نہ ہوا تھا جو بعد میں جا کر ہوا۔ ویدوں کے زمانے میں جَو کی کاشت ہوتی تھی، لیکن چاول کا نام نہ تھا۔

ان قدیم ہندوستانیوں کی ذہانت اور جوہر خداداد کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ فلکیات کو انھوں نے یونانیوں سے اخذ کیا (اگرچہ جیوتش پہلے ہی یہاں موجود تھی)، لیکن اس علم کو ان سے کہیں بڑھ کر تکمیل کو پہنچایا۔ ریاضی میں ہندسے اور اعشاریہ کا طریق شمار ایجاد کیا؛ الجبرا بھی انھی کی ایجاد تھی، اگرچہ اس علم نے عرب سے مغرب کو جاتے ہوئے مستقل طور پر عربی نام ہی اختیار کر لیا۔ جیومیٹری میں البتہ قدیم ہندوستانی کچھ خاص کامیاب نہ ہوئے، لیکن اس میں بھی بہت سی باتیں پہلے پہل انھی نے معلوم کیں۔ ہاں ٹرگنومیٹری میں وہ یونانیوں سے سبقت لے گئے۔ یہ سب کام عموماً صرف تین آدمیوں کے ممنون تکمیل ہیں۔ آریا بھاٹ، برہم گپت اور بھاسکر۔ بعد میں یہ علوم عرب سے ہوتے ہوئے یونان میں پہنچے اور پھر یورپ میں پھیلے۔ لیکن ان خشک علوم میں بھی آریاؤں نے اپنی شاعرانہ ذہنیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ذیل میں الجبرا کے دو سوال دیکھیے:

"مدھ مکھیوں کے ایک بڑے جھرمٹ میں سے کل کا پانچواں اڑ کر کدم کے پھولوں پر جا بیٹھیں، اگل کا تیسرا سلندھرا پھولوں پر، اور ان دونوں کے فرق کا تین گنا کٹجا کی کلیوں پر۔ ایک مدھ مکھی پیچھے رہ گئی اور وہ یوں ہی ہوا میں منڈلاتی رہی۔ اے سندر ناری! بتا تو سہی، سب کتنی مکھیاں تھیں؟"

"میری پیاری! تیرے کانوں میں جو یہ آٹھ لعل، دس زمرد اور سو موتی ہیں انھیں میں نے تیرے لیے یکساں قیمت پر خریدا تھا، اور وہ قیمت آدھے سو سے تین کم تھی۔ اے شیو ناری! مجھے ہر ایک کی قیمت بتا دے۔"

یہی شاعرانہ ذہنیت آگے چل کر علم ادب میں ایسے ایسے جواہر ریزوں کی تخلیق کا باعث ہوئی جو آج تک ساری دنیا کے لیے کیف و انبساط کا سامان ہیں؛ لیکن اس شاعرانہ افتاد طبع نے انھیں ان علوم میں ترقی کرنے سے نہ روکا جو نوع انسانی کے لیے عملی طور پر افادی درجہ رکھتے ہیں — کیمیا، طب اور علم تشریح الابدان کی دریافت اور ترقی بھی ان کے لیے جاذب نظر رہی۔ وہ ذرا ذرا سی باتیں جو آج ہمیں مغرب کے علما کی بتائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، قدیم ہندوستانیوں کے ذہن ہی سے نکلی تھیں۔ یہ دنیا ذرات کا مجموعہ ہے — یہ انھی کی معلوم کی ہوئی بات ہے۔ انسان ایک جرثومے سے نشو و نما پا کر دنیا میں آتا ہے — یہ بھی انھی کی معلوم کی ہوئی بات ہے۔ یہ تو ہوئے وہ علم جو عملی زندگی میں مفید ہیں، ذہنی زندگی میں سب سے بڑھ کر ترقی دینے والا علم فلسفہ ہے، اور فلسفے میں قدیم ہندوستانیوں نے جو کچھ کیا وہ تمام اہل عالم کے سامنے ہے اور عام بھی، اس لیے میں بھی اس کی طرف اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ یہ سب کام برہمنوں کے تھے، لیکن برہمنوں کی روز افزوں طاقت کے لیے ایک زبردست صدمہ بھی ہند قدیم میں پیدا ہوا۔ یہ مہاتما بدھ کی انسان پرست شخصیت تھی۔ بدھ کا ہر اصول برہمنوں کے مفاد کے منافی تھا۔ ایک ہی بات کو لیجیے: بدھ مساوات کا حامی بلکہ موجد تھا اور مساوات برہمنوں کی ذات کو مٹا دینے والا زبردست حربہ ہے۔ لیکن اس زمانے میں تعلیمی شعور چند محدود انسانوں میں ہی تھا، چناں چہ بدھ مت تو پھیلا لیکن برہمنوں کی طاقت از سرِ نو قائم ہو کر بڑھتی رہی۔ ۵۰۰ ق م کے قریب ہندوستانی ادب میں برہمنوں کے بنائے ہوئے پرانوں کی تخلیق ہوئی۔ ۳۲۶ ق م میں اسکندر نے پنجاب تک تمام ملک کو تہ و بالا کیا اور اس کی فوج کے لوٹ جانے پر ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

یہاں تک تو اس فضائے ہند پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالی گئی ہے جس کے اثرات میں امارو ایسا شاعر پیدا ہوا، لیکن امارو کی شاعری سو وہ حسی احساسات کو لذت بخشتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ایک مختصر خاکہ اس زمانے کے جنسی اور اخلاقی معیار کا بھی مدنظر رکھ لیا جائے۔ ویدوں کے زمانے سے لے کر اشوک اور چندر گپت تک عام اخلاق بہت ہی بلند تھے۔ ہم اپنی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ویدوں کے زمانے میں راجا مہاراجا لوگوں سے زبردستی کر لیتے تھے، لیکن سکندر کے مورخ کا بیان ہے کہ: "ہندو راست بازی میں ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کا چلن اس قدر معقول ہے کہ انھیں شاذ ہی باہمی معاملات کے فیصلے کے لیے مقدمے بازی کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔ ان کی ایمان داری کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی کوئی تحریری عہد نامہ نہیں کرتے، ہر بات زبانی ہی طے پاتی ہے۔ نیز وہ اپنے گھروں کو قفل بھی نہیں لگاتے۔ گویا وہ سچائی کے بہت ہی زبردست پرستار ہیں"۔ یہ تو ہوئی عام اخلاق کی حالت، لیکن جب ہم جنسی تعلقات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں رگ وید میں حرام تعلقات، اغوا، ننگی، اسقاط اور بدکاری کا ذکر مل جاتا ہے بلکہ اختلاط باہم جنس کا بھی خال خال بیان ہے، لیکن ویدوں سے بھی جو عام تصور ہم اس زمانے کے جنسی اخلاق کا قائم کرتے ہیں وہ بہت بلند ہے۔ مہابھارت اور رامائن میں بھی یہ بلندی قائم ہے۔ ان تمام کتابوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جنسی معاملات، زن و شوہر کے تعلقات اور گھریلو جھمیلوں میں ان لوگوں کے معیار کی بلندی آج کل کے لوگوں کے لیے قابل رشک درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔

شادی بیاہ کے مختلف طریقے تھے: زبردستی اٹھا کر لے جانا، خرید کر لے آنا یا باہمی رضامندی سے فیصلہ کر لینا۔ لیکن باہمی رضامندی کو کچھ مستحسن نہ خیال کیا جاتا تھا۔ عورتیں اس بات کو اپنے لیے قابل فخر سمجھتی تھیں کہ انھیں خرید کر حاصل کیا جائے۔ یہ خرید و فروخت کا کام غالباً مشاطہ یا دلال کے ذریعے سے انجام پاتا تھا جس کی مثال ہمیں امارو کی ایک نظم میں بھی ملتی ہے۔ زبردستی اٹھا لے جانا بھی ایک عورت کے لیے عزت کا باعث تھا شاید یوں اس کی خود پرستی کو تسکین ملتی تھی کہ ایک شخص اسے ہر قسم کے خطرات کے باوجود اٹھا کر لے گیا، یعنی وہ اسے بہت چاہتا ہے، اس نے اسی کو منتخب کیا ہے۔ کثرت ازدواج کا رواج بھی تھا اور بڑے امیر لوگوں میں تو یہ ایک لازمی بات تھی۔ اس کے مقابل میں کثرت ازدواج نسائی کی مثال بھی دروپدی کے افسانے سے ملتی ہے۔ یہ رسم لنکا میں ۱۸۵۹ء تک رائج تھی اور تبت کے چند علاقوں میں اب بھی ہے، لیکن عموماً کثرت ازدواج کی عشرت پرستی کا حق صرف مرد ہی کو حاصل تھا، اور اس زمانے کے گھر پر مرد کی ایک راجا کے مانند کلی حکومت ہوتی تھی۔ اس کی بیوی یا بیویاں اور بچے، اس کے دوسرے ساز و سامان کی طرح اس کی ملک تصور کیے جاتے تھے، لیکن ان باتوں کے باوجود اس زمانے میں عورت کو بعد کے ہندوستان سے (خصوصاً رامائن کے بعد سے) کہیں زیادہ آزادی حاصل تھی، اگرچہ شادی بیاہ کی جو صورتیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا، لیکن اس دور کی عورت کو اپنے رفیق حیات کے انتخاب میں بہت کچھ کہنے سننے کا حق تھا۔ عورتیں دعوتوں، رقص و سرود کی محفلوں اور پوجا پاٹ کے موقعوں پر مردوں کے دوش بدوش حصہ لیتی تھیں۔ انھیں مطالعے کی بھی اجازت تھی۔ وہ فلسفیانہ اور علمی گفتگو میں بھی دخل رکھتی تھیں۔ لیکن مہابھارت اور پھر رامائن کے زمانے میں عورت کا یہ آزاد رتبہ برقرار نہ رہا تھا۔ امارو والمیکی کا ذکر بھی کرتا ہے، لیکن اس کی نظموں سے عورتوں کے مرتبے کا جو تصور قائم ہوتا ہے وہ رامائن سے کہیں زیادہ آزادانہ محسوس ہوتا ہے، کیوں کہ رامائن کے بعد سے عورتوں کے لیے ویدوں کا پڑھنا بھی غیر مستحسن، بلکہ باعث فساد تصور کیا جاتا تھا۔ بیواؤں کی شادی ممنوع ہو گئی تھی، عورتوں اور مردوں کے سماجی میل جول پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں اور ستی کی رسم بھی جاری ہو گئی تھی۔ مثالی عورت وہی سمجھی جاتی تھی جو سیتا کے نقش قدم پر چلے لیکن امارو کی نظموں میں ہمیں عورت کی ذات پر یہ پابندیاں نظر نہیں آتیں۔

یہ زمانہ تھا، یہ لوگ تھے، یہ مرد، یہ عورتیں اور یہ سماج۔ علوم و فنون کی ترقی اور علم ادب اور سنسکرت زبان کا معیار انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اسی دور میں امارو کی شاعری پیدا ہوئی۔

امارو کے متعلق ہم سوانحی مواد کی غیر موجودگی کے باوجود اس کی نظموں کی اندرونی شہادت سے بھی کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں، مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شہری تھا، عالم فاضل تھا اور گمان غالب ہے کہ وہ برہمن ہوگا۔ اغلباً اس کا تعلق کسی راجا کے دربار سے نہ تھا، کیوں کہ اس صورت میں اس کا کچھ نہ کچھ حال ہمیں ضرور معلوم ہو جاتا۔ اس کی اپنی زندگی، خواہ وہ برہمن تھا یا غیر برہمن، بہت رومانی رہی ہوگی، کیوں کہ ان نظموں میں جن احساسات کا اظہار ہے ان کے متعلق اس عمدگی سے بغیر ذاتی تجربے کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ عورتوں

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مظہر امام: ایک مطالعہ

ڈاکٹر پریمی رومانی
1/3 نصیب نگر، جانی پور
جموں 180007

دوسری اور آخری قسط

'ایک لہر آتی ہوئی' مظہر امام کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے، اس میں اُن کے آٹھ مضامین شامل ہیں جو شعر وادب کے گوناگوں پہلوؤں پر دال ہیں۔ 'ایک لہر آتی ہوئی' بے لاگ اور دوٹوک تنقید کا اعلا نمونہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مظہر امام شعر وادب کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور انھیں کلاسکی ادب پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ جدید میلانات سے بھی بخوبی واقفیت تھی، اسی لیے اُن کے ہاں فکر وفن کے تنوع کے ساتھ ساتھ تجربے کی وسعت بھی ملتی ہے۔ غالب، اقبال، حسرت، جوش، فراق، شاد، فیض اُن کے پسندیدہ موضوعات ہیں جن کے فکر وفن پر انھوں نے 'ایک لہر آتی ہوئی' میں بے باکی سے لکھا ہے اور عصری تقاضے اور جدید تجربے کی رو سے نتیجہ اخذ کیا ہے۔ بعض لوگ اُن سے اختلاف رائے بھی کرتے ہیں، جس کا ثبوت جمیل الدین عالی کے اُس خط سے ملتا ہے جو موصوف نے مظہر امام کے 'غالب' والے مضمون کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے:

''آپ کا وہ مضمون بہت پسند آیا تھا۔ عنوان بھولتا ہوں، موضوع یاد ہے۔ غالب کا رنگ، جس میں آپ نے بڑے مزے کا فیصلہ دیا کہ غالب کا رنگ کوئی نہیں ہے۔ ممتنع، سہل ممتنع، سہل، بھی کچھ۔ میں نے اس پر ایک حلقے میں گفتگو کرائی تھی۔ کارروائی کی کہیں رپورٹ بھی ہوئی۔ مجھے آپ سے کامل اتفاق نہیں، لیکن بات آپ نے خوب نکالی تھی''۔

'ایک لہر آتی ہوئی' میں جو موضوعات ملتے ہیں وہ عام موضوعات سے ہٹ کر ہیں۔ غالب بے رنگ، اقبال تیسری دنیا کے لیے، حسرت کی غزل کا نشان منزل، جوش: جاہ وجلال کا شاعر، شاد عظیم آبادی کا ایک شاگرد، یکے از شارحین غالب: مولانا سہا، آفتاب تازہ اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ چند ایسے موضوعات ہیں جن کے بارے میں مظہر امام نے خصوصی انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مظہر امام موجودہ تنقیدی رجحانات سے مطمئن نہیں ہیں۔ اُن کے مطابق ادب میں تنقید اب برائے نام رہ گئی ہے۔ اس میں کھوکھلا پن آگیا ہے۔ خوشامد پسندی، نعرہ بازی اور بے جا خوش نویسی نے تنقید کے میدان کو بنجر بنا دیا ہے۔ اس طرح سے آج کا ادیب اور شاعر گھٹن محسوس کر رہا ہے، اُس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ مظہر امام 'ایک لہر آتی ہوئی' کے سرنامے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ تنقید جو ادب سے مسرت اور بصیرت اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے، خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے یہاں ادب کی تنقید کم کم ہے۔ البتہ تنقید کی تنقید خوب رہی ہے۔ ادب ہی سے زیادہ تنقید پُرزور ہے۔ 'خونِ فسادِ نقد' نے تخلیقی سرگرمیوں کو ماند کر دیا ہے۔ اب ملک ادب میں تخلیقی فن کار کی حیثیت دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شہری کی ہوگئی ہے۔ تنقید کی آمریت نے تخلیق کار سے اُس کی آزادی سلب کر لی ہے۔ بدذوقی کو ہوا دی ہے اور قاری کو ادب بدر کر دیا ہے۔ ایسے میں اگر کچھ لوگ واقعی ادب لکھ رہے ہیں تو محض اس لیے کہ یہ اُن کی مجبوری ہے تخلیقی مجبوری۔ اور اُن ہی کے دم سے تخلیقی ادب کا بھرم باقی ہے''۔

'ایک لہر آتی ہوئی' کے مضامین چار حصوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں 'ایک لہر آتی ہوئی'، 'ادبی تنقید: گمراہی کا منشور' اور 'آج کا ادیب: کتنا ادیب' جیسے مضامین شامل ہیں، جن میں تحقیق وتنقید کے مختلف میزانوں کو سامنے رکھ کر مظہر امام نے ادب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے نظریات سے ثابت کیا ہے کہ دورِ حاضر کی ادبی تنقید گمراہی کا منشور ہے۔ وہ اس دور کے ادیب پر بھی نظر رکھتے ہوئے ہیں اور اپنے تنقیدی پیمانوں سے اس کو آمیز رکھنے کی سعی کرتے ہیں کہ اس میں ادب کو جانچنے کا کتنا شعور ہے۔

'آتی جاتی لہریں' کا دوسرا حصہ غالب، اقبال، حسرت، جوش، فراق اور شاگرد شاد منظور احمد نظر کے فکر وفن سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔ مظہر امام کے یہ مضامین انفرادیت کے حامل ہیں۔ غالب اور اقبال کو پر اظہار خیال کرتے وقت وہ قارئین کو ان دو شعرا کے نئے نئے رنگوں سے بھی آشنا کراتے ہیں۔ مظہر امام کے دل میں غالب اور اقبال کے فکر وفن کے بارے میں بعض اہم سوالات ابھرتے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے وہ بڑی جستجو کرتے ہیں۔ مظہر امام سائنٹفک نظریہ رکھتے ہیں، اس لیے قیاس آرائیوں پر عمل کرنا ان کے مزاج میں شامل نہیں ہے۔ اُن کے یہ مضامین پڑھنے کے بعد قارئین اس امر سے آگاہ ہوتے ہیں کہ اُن کا میزان نقد ونظر جداگانہ ہے اور اُن کی تحریروں میں اندرونی وحدت ملتی ہے۔ وہ تنقید وتحقیق کا یہی میزان باقی مضامین کا تجزیہ کرنے میں بھی اپناتے ہیں۔ وہ حسرت کی غزل کا نشان امتیاز تلاش کرنے پر بھی مصر ہیں اور جوش کو جاہ وجلال کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ فراق کی شاعری سے بھی دل چسپی لیتے ہیں اور شاد عظیم آبادی کے شاگرد پر بھی بات کرتے ہیں۔ مظہر امام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تنقیدی میزانوں کو اپناتے وقت تعصب سے کام نہیں لیتے اور نہ فیصلہ دیتے وقت دور کی کوڑی لاتے ہیں، بلکہ اپنے انوکھے انداز میں بات کہنے کا گر رکھتے ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ نثر نگاری کے لیے وقف رکھا گیا ہے۔ اس میں وہ احتشام حسین، فیض احمد فیض، جگن ناتھ آزاد اور حامدی کاشمیری کے علاوہ مولانا سُہا پر بات کرتے ہیں۔ مظہر امام، احتشام حسین کی تنقید نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں ایک بالغ نظر نقاد قرار دیتے ہیں۔ انھیں احتشام حسین کی تحریروں میں ایک اندرونی وحدت کار فرما نظر آتی ہے۔ اُن کے مطالعے میں قیاس آرائیوں پر عمل کرنا احتشام حسین کے مزاج میں نہیں ہے بلکہ وہ پہلے مکمل طور پر تحقیق کرتے ہیں اور پھر بات وضاحت سے بیان کرنے کے قائل ہیں۔ مظہر امام کو فیض کی تنقید نگاری میں بھی انفرادیت نظر آتی ہے۔ وہ انھیں ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باشعور نقاد بھی مانتے ہیں، جن کی تحریروں سے جدید تنقید نگاری میں اضافہ ہوا ہے۔

مظہر امام، جگن ناتھ آزاد کے سفر نامے 'پشکن کے دیس میں' پر بھی اس کتاب میں تبصرہ کرتے ہیں اور اس طرح سے پڑھنے والوں کو روس سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ وہ آزاد کو روس کے سفر کے دوران حالات کو جمع کرنے اور ان کو خوبیوں کے ساتھ تحریر کرنے پر داد دیتے ہیں، لیکن انھیں تعجب ہے کہ آزاد کو اپنے سفر کے دوران کوئی تلخ تجربہ نہیں ہوا ہے اور ایسی کوئی بات نہیں جو اُن پر گراں گزری ہو۔ یہ اُن کے لیے ایک سوالیہ نشان ہے کہ کیا آزاد نے قصداً ایسی باتوں کے اظہار سے اجتناب کیا ہے؟

'حامدی کاشمیری: شاعر نقاد' بھی بڑا دل چسپ مضمون ہے، اس میں حامدی کی شاعری کے بارے میں تفصیلی گفتگو ملتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کی تنقید نگاری کا بھی بڑا مفصل جائزہ ملتا ہے۔ وہ حامدی کو ایک اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اکتشافی تنقید کے نظریہ ساز تصور کرتے ہیں۔

اس حصے کا اہم مضمون 'یکے از شارحین غالب: مولانا سہا' ہے۔ یہ مضمون تحقیقی نوعیت کا ہے اور اس میں ہر جگہ دل چسپی کا عنصر غالب ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں دو اہم مضامین ملتے ہیں: (۱) بہار میں اردو افسانہ ۱۹۳۶ء کے آس پاس (۲) مغربی بنگال میں اردو شاعری آزادی کے بعد۔ یہ دونوں مضامین موضوعات کے اعتبار سے اپنی جگہ اہم اور تاریخی نوعیت کے ہیں اور جن سے ۱۹۳۶ء کے آس پاس بہار میں اردو افسانے اور آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو شاعری کا منظر نامہ سامنے آتا ہے۔

'ہندوستانی ادب کے معمار' سیریز کے تحت ساہتیہ اکادمی کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں کا سلسلہ گزشتہ کئی برسوں سے چلا آرہا ہے۔ مظہر امام کی کتاب 'جمیل مظہری' (مونوگراف) بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مظہر امام جمیل مظہری سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ اُن کے ہم وطن بھی تھے اور بزرگ بھی۔ اس لیے سالہا سال تک ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔ مظہر امام نے جمیل مظہری پر بعض اچھے اور معیاری مضامین لکھے جو ملک اور بیرون ملک میں کئی معیاری جرائد و اخبارات میں شائع ہوئے اور اب یہ کتاب جمیل مظہری پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب ۹۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس میں جمیل کے خاندان، اُن کی تعلیم، اُن کے تلمذ، اُن کی ملازمت، شادی، عادات و خصائل اور وفات کے بارے میں بعض اہم اطلاعات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مونوگراف سے جمیل کے لکھنے پڑھنے کا آغاز، مشاہیر سے اُن کی ملاقات، علمی دنیا کے ساتھ اُن کے تعلقات اور اُن کی تصانیف کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔ مظہر امام نے جمیل مظہری کی شاعری اور اُن کی افسانہ نگاری پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جمیل مظہری پر کام کرنے والے مظہر امام کی اس تصنیف کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

'آزاد غزل کا منظر نامہ' (ضمیمہ 'کتاب نما') مظہر امام کا ایک اور نثری کارنامہ ہے۔ یہ آزاد غزل کی اشاعت کے پچیس سال (جنوری ۱۹۶۲ء سے دسمبر ۱۹۸۶ء تک) کے رسالوں اور اخباروں

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

ڈی ایس ایس ایس بی نے اساتذہ کی نشان دہی کے بعد اردو کی جوابی شیٹ سے خامیوں کو دور کیا

نئی دہلی (۸؍جون)۔ دہلی سب آرڈینیٹ سروسز سلیکشن بورڈ (ڈی ایس ایس ایس بی) کے زیر اہتمام منعقدہ اردو ٹیچرس کے امتحان کے لیے تیار شدہ سوالات کی جوابی شیٹ میں فاش غلطیاں رہ جانے کے تعلق سے روزنامہ 'انقلاب' میں شائع خبر کے بعد ڈی ایس ایس ایس بی پر ہر طرف سے تنقید ہورہی تھی جس پر شرمندہ ڈی ایس ایس ایس بی نے اپنی غلطی سدھارنے کی کوشش کی ہے۔ ذرائع کے مطابق ڈی ایس ایس ایس بی نے جن سوالات کی تیار شدہ جوابی شیٹ میں غلطیاں رہ گئی تھیں انھیں درست کرکے دوبارہ سے انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کردیا ہے۔ واضح رہے کہ ایک ماہ قبل ڈی ایس ایس ایس بی نے اردو ٹیچر کے عہدوں کے لیے تحریری امتحان لیا تھا۔ امتحان دینے والے امیدواروں نے گھر آکر دیے گئے صحیح جوابات کو ڈی ایس ایس ایس بی کی جوابی شیٹ سے ملاکر دیکھا تو انھیں حیرت ہوئی کہ شیٹ میں صحیح جواب کی بجائے غلط جواب کا اندراج کیا گیا ہے۔ دراصل جس جوابی شیٹ کے ذریعے ڈی ایس ایس ایس بی پرچۂ امتحان کی جانچ کرواتی ہے اس میں درجنوں غلط جوابات دیے گئے ہیں، اب ظاہر ہے کہ اگر کسی امیدوار نے صحیح جواب دیا ہے تو کمپیوٹرائزڈ چیکنگ کے دوران ڈی ایس ایس ایس بی کی شیٹ کے مطابق جواب نہ دیے جانے پر آپ ناکام ہوجائیں گے، گرچہ آپ کا جواب صحیح معنوں میں درست ہو۔ ڈی ایس ایس ایس بی کی تساہلی پر اردو تنظیم اردو سبجیکٹ ٹیچرس ایسوسی ایشن دہلی (یو ایس ٹی اے) نے احتجاج کرتے ہوئے دہلی سرکار کو شکایتی مکتوب بھی ارسال کیا تھا۔ یو ایس ٹی اے کے صدر شمس الدین اور جنرل سکریٹری وقار احمد نے 'انقلاب' کو بتایا کہ جوابی شیٹ میں آٹھ غلطیاں رہ گئی تھیں جسے ڈی ایس ایس ایس بی نے درست کرلیا ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ڈی ایس ایس ایس بی کے ذریعے دی گئی جوابی شیٹ سے موازنہ کرنے کے بعد ہمیں ۱۱۱، ۱۳۵، ۱۵۱، ۱۵۷، ۱۷۸، ۸۵، ۱۹ اور ۲۰۰ نمبر کے سوالات کے جوابات غلط ملے تھے، جنھیں اب درست کرلیا گیا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے کرناٹک کے وزیر اعلا کو اردو منچ کا میمورنڈم

بنگلور، کرناٹک۔ آل انڈیا اردو منچ کے عہدیداروں نے جن میں خلیل مامون، شائستہ یوسف، عزیز اللہ بیگ، اعظم شاہد، این ڈی ملا، اعجاز علی، شکیل پاشا، رؤف قادری اور دیگر حضرات نے وزیر اعلا سدرامیا سے ملاقات کی اور انھیں اردو زبان و ادب کے مسائل سے متعلق ایک عرض داشت پیش کیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ حکومت کرناٹک کو اردو زبان و ادب کے تعلق سے ایک ایسی پالیسی ترتیب دینی چاہیے جس کے تحت اردو کو اس کا جائز مقام مل سکے۔

☆ راجیہ اتسوا ایوارڈ میں اردو کے کم از کم دو افراد کو اس ایوارڈ سے نوازا جائے۔

☆ دسہرہ بھی اتسو اور بنگلور ہبا جیسے سرکاری تقریبات میں اردو کے پروگرام بھی شامل کیے جائیں۔

☆ کرناٹک اردو اکادمی کے فنڈ کو خاطر خواہ طور پر بڑھایا جائے۔ ایک عرصے سے بنگلور میں اردو ہال اور اردو کمپلیکس کی تعمیر کا مسئلہ التوا میں پڑا ہوا ہے، حکومت اردو ہال کے لیے کم از کم 1/2 ایکڑ زمین گرانٹ میں دے۔ اس کے ساتھ ہال کی تعمیر کے لیے دس کروڑ روپے مختص کرے۔

☆ حکومت کو نئی زمانہ اردو بولنے والے عوام کے مسائل کا کوئی علم نہیں کیوں کہ اس کے خفیہ محکمے اور پولس محکمے میں کوئی اردو جاننے والا نہیں۔ وزیر اعلا کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

☆ ترجمے کے محکمے میں اردو مترجم کی اسامی ایک عرصے سے خالی پڑی ہوئی ہے اسے فوری طور پر پُر کیا جائے۔

☆ فی الحال ریاستی لائبریری اور ضلع سطح کی لائبریریوں میں اردو کی کتابیں خریدی نہیں جاتیں۔ حکومت، ڈائرکٹر لائبریری کو اس تعلق سے یہ ہدایت جاری کرے کہ اردو کتابوں کی خرید کے لیے ایک معقول رقم مختص کی جائے۔

☆ اردو ڈائرکٹوریٹ کو صحیح طور پر ترتیب دیا جائے، اس کے چلانے کے لیے معقول لوگوں پر مبنی ایک صلاح کار کمیٹی کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

☆ پرائمری اور ہائر پرائمری اور سیکنڈری سطح پر لاتعداد استادوں کی اسامیاں خالی ہیں انھیں فوری طور پر پُر کیا جائے۔

☆ یونیورسٹیوں میں اردو پروفیسروں کے عہدے خالی پڑے ہیں مثال کے طور پر بنگلور اور دھارواڑ یونیورسٹیوں میں، انھیں فوری طور پر پُر کیا جائے۔

☆ اردو نصابی کتابوں کی دستیابی میں گورنمنٹ پریس سے اکثر تاخیر ہوتی ہے۔ احکام جاری کیے جائیں کہ اردو نصابی کتابیں تعلیمی سال کے شروع میں ہی جاری کی جائیں۔

(سالار۔ بنگلور)

سینٹ اسٹیفن کالج میں اردو کے لیے سیٹیں مخصوص

نئی دہلی (۵؍جون)۔ دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں ہسٹری آنرس، انگلش آنرس اور فلاسفی آنرس میں ان طلبہ کے لیے چند سیٹیں مخصوص کی گئی ہیں جنھوں نے بارہویں کلاس میں اردو کا امتحان پاس کیا ہے۔ اردو کے طلبہ کو کٹ آف میں خصوصی رعایت دی جائے گی۔ یہ رعایت مجموعی طور پر 5 سے 15 فیصد تک ہوگی۔ جن طلبہ کا ان کورسوں میں داخلہ ہوگا انھیں اپنے مین سبجیکٹ کے ساتھ ساتھ اردو بھی ایک مضمون کے طور پر پڑھنی ہوگی۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میڈیم اسکولوں کے حوصلہ افزا نتائج

حیدرآباد (۳؍جون)۔ عام طور پر اردو میڈیم سرکاری اسکولوں کے بارے میں لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ یہاں پڑھائی نہیں ہوتی، بچے کھیل کود میں اپنا وقت برباد کرتے ہیں اور اساتذہ صرف تنخواہوں کے حصول کے لیے ان اسکولوں میں وقت گزاری کرتے ہیں مگر یہ خیال اب بہت حد تک غلط ثابت ہورہا ہے۔ پچھلے چند برسوں سے مذکورہ اسکولوں کے تعلیمی نتائج، والدین اور سرپرستوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے تئیں دل چسپی اور ان میں یہ احساس پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے کہ مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت مسلم ہے اور اردو ذریعۂ تعلیم کا بھی مستقبل روشن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے شہر کا پس ماندہ علاقہ وٹے پلی میں قائم ماڈل اسکول میں جب تعلیم کا آغاز ہوا تھا اس وقت صرف 117 طلبہ و طالبات نے اس اسکول میں داخلہ لیا تھا، جب کہ آج یہاں 784 طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں، جہاں انھیں جملہ 28 اساتذہ تعلیم و تربیت فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔ مرکزی بورڈ کے تحت چلائے جارہے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ماڈل اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر شکیل احمد نے 'سیاست' سے بات کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی اس اسکول کے نتائج صد فیصد رہے ہیں جن میں سے جملہ 6 طلبہ نے امتیازی نشانات حاصل کیے ہیں، جن کے نام اقبال احمد 83.6 فیصد، سیدہ ثوشین 79.8 فیصد، شیخ محمد اسرائیل 77.9 فیصد، ریحان احمد 76 فیصد، ریشما افشاں 76 فیصد اور شیخ محمد اسماعیل 76 فیصد ہیں۔ اسی طرح جملہ 11 طلبہ نے درجہ اول سے کامیابی حاصل کی ہے جب کہ تین طالبات نے درجہ دوم سے کامیابی حاصل کی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ معاشی طور پر پس ماندہ سمجھے جانے والے علاقے وٹے پلی فلک نما میں ماڈل اسکول کے قیام اور طلبہ و اساتذہ کے مسلسل عمدہ تعلیمی مظاہرے نے مقامی عوام میں تعلیمی تحریک پیدا کردی ہے اور اردو میڈیم کے حوالے سے لوگوں کے ذہنوں میں موجود غلط فہمیاں دور ہونے لگی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب زیادہ سے زیادہ والدین اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں داخلہ دلا رہے ہیں اور اس کے بہتر نتائج بھی برآمد ہورہے ہیں۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

اردو میڈیم کے لیے 439 جونیئر لیکچررس کی اسامیوں کو پُر کرنے کا مطالبہ

حیدرآباد (۹؍جون)۔ ایس آئی او آندھرا پردیش کے بموجب ریاست میں اردو میڈیم گورنمنٹ جونیئر کالج سے جملہ 13,000 سے زائد طلبہ تعلیم حاصل کررہے ہیں، جن کے لیے حکومت 130 لیکچررس ریگولر اساس پر فراہم کررہی ہے جب کہ 278 لیکچررس کنٹریکٹ اساس پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایس آئی او آندھرا پردیش نے ان تمام حقائق سے اپنی رپورٹ کے ذریعے حال ہی میں پردہ فاش کیا تھا اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ مطلوبہ 439 اسامیوں کو آنے والے APPSC کے اعلامیہ میں شامل کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ حکومت اردو میڈیم لیکچررس کے لیے علاحدہ سیٹیں مختص کرتے ہوئے اردو میڈیم لیکچررس کے ساتھ انصاف کرے۔ دوسری جانب حکومت جونیئر لیکچررس کی 4523 سیٹوں کو بذریعۂ انٹرنس ٹسٹ پُر کرنے کا وعدہ کررہی ہے۔ اس سلسلے میں ایس آئی او حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ان 4523 سیٹوں میں اردو میڈیم کالجوں کے لیے سیٹوں کی وضاحت کرے۔ یاد رہے کہ ایس آئی او آندھرا پردیش وزیر تعلیم اور پرنسپل سکریٹری سے ملاقات کرتے ہوئے اپنی سروے رپورٹ کو پیش کرچکی ہے۔ اگر حکومت ان مطالبات کی تکمیل سے کنارہ کشی اختیار کرتی ہے تو ایس آئی او ریاست بھر میں شعور بیداری کے پروگرام منعقد کرتے ہوئے اپنے جائز حق کو منوانے کی سعی کرے گی۔ دوسری جانب ایس آئی او دوم جماعت کامیاب طلبہ اور ان کے والدین سے گزارش کرتی ہے کہ اقامتی جونیئر کالجوں میں داخلہ دلائیں جہاں طلبہ کو رہائش و طعام اور ایم پی سی و دیگر سہولیات بالکل مفت دستیاب رہتی ہیں۔ ایس آئی او حکومت سے گزارش کرتی ہے کہ وہ اس متوقع اعلامیہ میں اردو میڈیم لیکچررس کی اسامیوں پر خصوصی توجہ مرکوز کرتے ہوئے اردو کے ساتھ انصاف کرے۔

(منصف۔ حیدرآباد)

اگنو میں شعبۂ اردو کے قیام کا خیر مقدم

نئی دہلی (۱۰رجون)۔ 'ہمدم' کے قومی صدر پروفیسر انور پاشا نے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (نئی دہلی) میں شعبۂ اردو کے قیام اور اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے دیے گئے اشتہار کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے مرکزی حکومت کے ذریعے اردو تعلیم کے فروغ کی سمت میں اٹھایا گیا ایک قابل ستائش قدم قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمدم کا یہ دیرینہ مطالبہ تھا کہ دیگر زبانوں کی طرح اگنو میں اردو تعلیم کا بھی شعبہ قائم ہو۔ ہمدم اس سلسلے میں سابق وزیر تعلیم ارجن سنگھ کے زمانے سے ہی کوشاں تھی۔ ہمدم نے اس سلسلے میں یو پی اے چیئرپرسن سونیا گاندھی، وزیر اعظم منموہن سنگھ، سابق وزیر تعلیم کپل سبل اور موجودہ وزیر تعلیم پلم راجو کو مسلسل کئی میمورنڈم پیش کیے تھے۔ کپل سبل اور موجودہ وزیر تعلیم پلم راجو نے تحریری طور پر ہمدم کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ جلد ہی اگنو میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آئے گا۔ انور پاشا نے کہا کہ مرکزی حکومت نے اردو والوں کے اس دیرینہ مطالبے کو پورا کرتے ہوئے اگنو میں شعبۂ اردو کے قیام کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ سردست اگنو میں اردو کی سات اسامیوں کا اشتہار آیا ہے جن میں پروفیسر، ریڈر اور لکچرار کی اسامیاں شامل ہیں۔

پروفیسر انور پاشا نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ گزشتہ چند برسوں میں مرکزی حکومت نے کئی ریاستوں میں متعدد مرکزی یونیورسٹیاں قائم کی ہیں جن میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو کے قیام اور اردو اساتذہ کی تقرری کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے جب کہ دیگر زبانوں اور علوم کے شعبے قائم ہو چکے ہیں اور اساتذہ کی تقرری کے لیے اسامیوں کا اشتہار بھی شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمدم نے میمورنڈم پیش کر کے اس سلسلے میں محترمہ سونیا گاندھی، وزیر اعظم منموہن سنگھ اور وزیر تعلیم پلم راجو سے مطالبہ کیا ہے کہ ان تمام نئی مرکزی یونیورسٹیوں میں بھی جلد از جلد شعبۂ اردو کے قیام اور اردو اساتذہ کی تقرری کا اہتمام کیا جائے۔ پروفیسر پاشا نے اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہی دیگر تنظیموں سے بھی گزارش کی کہ وہ بھی اس سلسلے میں مرکزی حکومت کو میمورنڈم پیش کر کے اس مطالبے کو پر زور بنائیں تاکہ آئندہ عام انتخابات سے قبل اس سلسلے میں عملی اقدام ممکن ہو سکے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

بنگنور میں اردو میڈیم جونیئر کالج کے قیام کو یقینی بنانے کے لیے نمائندگی

حیدرآباد (۳رجون)۔ اے پی مائنارٹیز کمیشن کے چیئرمین جناب عابد رسول خاں سے سابق چیئرمین بلدیہ بنگنور ضلع کرنول حاجی ڈی بشیر احمد کی قیادت میں ایک وفد نے ملاقات کر کے ان سے بنگنور میں اردو میڈیم جونیئر کالج کے قیام کو یقینی بنانے کی نمائندگی کی تاکہ یہاں سے ایس ایس سی کامیاب کرنے والے طلبہ و طالبات کو انٹرمیڈیٹ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے۔ حاجی ڈی بشیر نے بتایا کہ بنگنور میں اردو میڈیم کالج نہ ہونے کی وجہ سے اردو میڈیم کے طلبہ ترک تعلیم کر رہے ہیں۔ جناب عابد رسول خاں نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ اس ضمن میں چیف منسٹر سے ملاقات کر کے بنگنور میں اردو میڈیم کالج کے قیام کو یقینی بنائیں گے۔ اس وفد میں ایم ایم یوسف، جناب ٹی محبوب پاشاہ، کے محمد آصف، ایم محمد سلیم اور نامہ نگار روزنامہ رہنمائے دکن احمد حسین بھی موجود تھے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

پنملیڈی اردو اسکول 6 سالوں سے بند

دیہی طلبہ اردو تعلیم سے محروم، محبان اردو توجہ دیں

چتامنی۔ شہر چتامنی سے 35 کلومیٹر دوری پر واقع پنملیڈی کے نام کا ایک دیہات ہے، جو آندھرا پردیش کا سرحدی علاقہ ہے۔ اس میں پندرہ سال قبل اردو سرکاری اسکول قائم کیا گیا جس میں 30 سے زیادہ بچے اردو تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس موضع میں 120 مسلم گھروں کی آبادی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے بچوں کو اردو تعلیم سے محروم کر دیا گیا ہے کیوں کہ گزشتہ پانچ چھ سالوں سے یہ سرکاری اسکول بند پڑا ہے اور اسے بغیر کسی اجازت کے اسپتال میں تبدیل کیا گیا ہے۔ وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ پانچ سال قبل یہاں اردو اساتذہ آتے تھے اور ان کی لاپروائی کی وجہ سے یہاں کے اساتذہ کو دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ اس کے متعلق ہم نے کئی مرتبہ بی آر پی افسروں کو اطلاع کی کہ ہمیں یہاں اردو تعلیم کی ضرورت ہے لیکن پانچ سال سے کسی نے بھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ گاؤں والوں نے اسکول کے متعلق کئی مرتبہ کنڑا اخباروں میں شائع بھی کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہاں کے ذمہ داروں نے بتایا کہ اس سلسلے میں پانچ سال قبل بی ای او سے بھی شکایت کی گئی لیکن انھوں نے بھی کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس تعلق سے 'سالار' کے نامہ نگار نے نو منتخب رکن اسمبلی بی۔ کے۔ کرشنا ریڈی سے فون پر بات کی تو انھوں نے بتایا کہ مجھے اس کی اطلاع نہیں ہے، میں جلد ہی اس گاؤں کا دورہ کر کے وہاں کے حالات کے متعلق معلومات حاصل کر کے دوبارہ اردو اسکول کو شروع کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلے میں بی آر پی سلیم سے بات کی تو انھوں نے بتایا کہ دو تین دنوں کے اندر ہم بیٹھ کر اس کے متعلق بات چیت کر کے دوبارہ اسکول شروع کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اردو کے چاہنے والے اس طرف جلد توجہ دیں تو عنقریب وہاں پھر سے اردو اسکول قائم ہو سکتا ہے۔ (سالار، بنگلور)

خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی میں جولائی سے پڑھائی شروع ہوگی

لکھنؤ (۳رجون)۔ خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی کی ایگزیکیوٹو کونسل کی چوتھی میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ جولائی سے بی اے، بی اے (آنرز)، جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن میں ڈگری، بی ٹی سی اور اردو میڈیم سے ڈپلومہ کے کورس، بی کام، بی بی اے، ایم بی اے، بی سی اے، بی ایس سی (ہوم سائنس)، بی ایڈ، ایم ایڈ وغیرہ کے کورسز شروع کیے جائیں گے۔ پراسپیکٹس کو منظوری دے دی گئی جس میں داخلے کی شرطیں تفصیل سے دی گئی ہیں۔ سلیکشن کمیٹیوں نے ہندی، مینجمنٹ، ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم اور ایجوکیشن محکموں کے لیے لکچرر، ریڈر اور پروفیسر وغیرہ کے عہدوں پر تقرری کے لیے جو سفارشیں کی تھیں انھیں ایگزیکیوٹو کونسل نے منظوری دے دی۔ لائبریری اور کمپیوٹر سینٹر کی تعمیر کے لیے یو جی سی سے حاصل کی گئی 2.5 کروڑ روپے کی گرانٹ کو استعمال کرنے کی منظوری دی گئی۔ چوں کہ ابھی اس یونیورسٹی کے آرڈیننس تیار نہیں ہوئے ہیں اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ بورڈ آف اسٹڈیز اور دوسری کمیٹیوں کی تشکیل کرتے ہوئے فی الحال حسب ضرورت لکھنؤ یونیورسٹی کے آرڈیننس کو استعمال میں لایا جائے۔ یونیورسٹی کا لوگو بھی منظور کیا گیا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اک دیا اور بجھا

○ سکندر احمد ○ قمر علی عباسی ○ اختر پیامی

اردو کے ممتاز ادیب اور ناقد جناب سکندر احمد کا بھوپال میں ۳۰ مئی ۲۰۱۳ کی صبح 53 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم گزشتہ سال ہی ممبئی سے ٹرانسفر ہو کر بحیثیت ڈپٹی جنرل منیجر اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں تعینات ہوئے تھے۔ سکندر احمد کا نئی نسل کے لکھنے والوں میں نمایاں نام تھا۔ وہ نہ صرف شاعری اور فکشن کے نقاد تھے بلکہ عروض میں بھی انھیں بڑی دسترس حاصل تھی۔ اردو ادب کو خصوصاً تنقید کے میدان میں ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔

سکندر احمد نے افسانہ کیا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی پر ایک وقیع اور جامع کتابچہ تحریر کیا ہے۔ 'شب خون' الہ آباد اور سہ ماہی 'اردو ادب' دہلی میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ 'اثبات' میں بھی کچھ مضامین شائع ہوئے۔ مرحوم اپنے مضامین کو یکجا کر کے شائع کرنا چاہتے تھے۔ آج کل وہ فن عروض پر کام کر رہے تھے۔ سکندر احمد مرحوم منکسر المزاج، بذلہ سنج اور دلکش لب و لہجے کے انسان تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

حیدرآباد۔ اردو کے ممتاز شاعر، ادیب اور براڈکاسٹر قمر علی عباسی کا ۱۳ رمئی ۲۰۱۳ کو امریکہ میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ نماز جنازہ یکم جون کو مسجد دار القرآن نیویارک امریکہ میں ادا کی گئی۔ مرحوم 9 سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مری ہلز میں حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد سندھ واپس ہوئے جہاں انھوں نے یونیورسٹی آف سندھ سے اعلا تعلیم حاصل کیا جس کے بعد بی اے (آنرز)، ایم اے (اکنامکس) اور ایم اے اردو بھی اسی یونیورسٹی سے کیا۔ انھوں نے نیشنل کالج کراچی میں بحیثیت اکنامکس لکچرر وابستہ ہونے کے بعد سی ایس ایس کامیاب کیا اور 1966 میں ریڈیو پاکستان، لاہور میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر ہوئے جہاں 32 سال تک خدمات انجام دیے اور اسٹیشن ڈائرکٹر اور دیگر کئی اعلا عہدوں پر خدمات انجام دے کر سبکدوش ہوئے۔ انھیں آل پاکستان نیوز پیپرس کا باوقار ایوارڈ سال ۱۹۹۱ میں اس وقت کے وزیر اعظم کے ہاتھوں دیا گیا۔ اس کے علاوہ سال ۲۰۰۰ میں تمغۂ امتیاز بھی صدر پاکستان کے ہاتھوں دیا گیا۔ قمر علی عباسی صاحب کچھ عرصے سے اپنی اہلیہ کے ساتھ امریکہ میں مقیم تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

نئی دہلی۔ ممتاز شاعر اور صحافی جناب اختر پیامی کا کراچی میں ۱۹ راپریل ۲۰۱۳ کو انتقال ہو گیا۔ وہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ اختر پیامی کا تعلق ہندوستان کے صوبہ بہار سے تھا، ان کی پیدائش ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے معاشیات میں گریجویشن کیا، کچھ دنوں ان کا قیام کلکتہ میں بھی رہا، جہاں وہ ہفت روزہ 'نئی منزل' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اس کے بعد وہ مشرقی پاکستان چلے گئے، جہاں انھوں نے 'مارننگ نیوز' سے انگریزی میں اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز کیا۔ وہ کراچی کے مشہور انگریزی اخبار 'ڈان' کے نیوز ایڈیٹر بھی رہے۔ اختر پیامی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ شاعری اور صحافت میں ان کے ترقی پسندانہ خیالات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو شعر و ادب میں بھی انھوں نے نئے تجربے کیے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'تاریخ' اور 'کفن' بہت مشہور ہیں۔ اختر پیامی کے بھائیوں میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ فکشن نگار پروفیسر جابر حسین اور ممتاز ناقد پروفیسر ش اختر ادبی اور علمی دنیا میں منفرد شناخت رکھتے ہیں، جب کہ ان کی بہن ذیشان فاطمی اردو کی مشہور ادیبہ ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

انجمن ترقی اردو (ہند) کے مختلف شعبوں اور اشخاص کی ای میل آئی ڈیز

ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے گزشتہ کئی شماروں میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے مختلف شعبوں اور متعلقہ اشخاص کی ای میل آئی ڈیز شائع کی گئی تھیں، لیکن ای میل آئی ڈیز کی طوالت کی وجہ سے کچھ مشکل پیش آرہی تھی، اس لیے انھیں مختصر کردیا گیا ہے۔ اب انجمن کے مختلف شعبوں کے متعلقہ اشخاص کی نئی ای میل آئی ڈیز درج ذیل ہیں۔ پرانی ای میل آئی ڈی ساقط کردی گئی ہے۔

- صدر (صدیق الرحمٰن قدوائی): president@atuh.org
- نائب صدور (سید شریف الحسن نقوی اور خلیق انجم): vicepresident@atuh.org
- جنرل سکریٹری (اطہر فاروقی): gen.secretary@atuh.org
  ather.farouqui@atuh.org
- ہماری زبان: hamarizaban@atuh.org
- بک ڈپو: bookdepot@atuh.org
- مدیر سہ ماہی 'اردو ادب' (اسلم پرویز): aslam.parvez@atuh.org
- اکاؤنٹ آفیسر (مظہر عباس نقوی): mazahr.naqvi@atuh.org
- ایڈمنسٹریٹو آفیسر (ثاقب صدیقی): saquib.siddiqui@atuh.org
- ایڈمنسٹریٹو آفیسر اور لائبریرین (شاہد خاں): shahid.khan@atuh.org
- انچارج بک ڈپو اور آرکائیوز (انیس احمد): anis.ahmed@atuh.org
- شریک مدیر 'ہماری زبان' (محمد عارف خان): arif.khan@atuh.org
- پی اے ٹو جنرل سکریٹری (جاوید رحمانی): jawaid.rahmani@atuh.org

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : عصمت چغتائی اور جین آسٹین
مصنف : محبوب حسن
ضخامت : ۱۲۱ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز دہلی،
تبصرہ نگار : ڈاکٹر جاوید قمر (دہلی)

محبوب حسن بنیادی طور پر تحقیق کار ہیں۔ ادب اطفال اور طنزیہ و مزاحیہ ادب سے انھیں خاص شغف ہے۔ ان کی نظمیں اور انشائیے تواتر کے ساتھ مختلف جرائد و رسائل کی زینت بن رہے ہیں۔ تحقیق و تنقید سے بھی انھیں دل چسپی ہے۔ 'عصمت چغتائی اور جین آسٹین' ان کی تازہ ترین تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے عصمت چغتائی اور جین آسٹین کی ناول نگاری کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ مطالعہ عصمت چغتائی کے شاہکار ناول 'ٹیڑھی لکیر' اور جین آسٹین کے 'پرائیڈ اینڈ پریجوڈس' کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ جین آسٹین، انگریزی ناول کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ ان کے ناول "Domestic Novel" کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان کے یہاں فکر و موضوعات کی سطح پر کوئی خاص تنوع نہیں ملتا۔ تاہم گھریلو قسم کے مسائل کی پیش کش میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ عصمت چغتائی بھی اردو ناول کا ایک ناقابل فراموش نام ہے۔ ان کے یہاں بھی متوسط طبقے کے مسائل کی بازیافت ملتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انھوں نے عصمت چغتائی اور جین آسٹین کی شخصیت اور سوانحی کوائف سے گفتگو کی ہے۔ اس کے تحت انھوں نے دونوں مصنف کی زندگی کے سوانحی کوائف اور علمی و ادبی پس منظر کے ہر ممکنہ پہلو کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ محبوب حسن نے دونوں کے سوانحی کوائف کی یکسانیت اور افتراق کے پہلو کو بھی تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ دونوں فکشن نگار روایت شکن کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں کی پرورش اور ذہنی آبیاری علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ دو مختلف تہذیب و معاشرت میں پیدا ہونے کے باوجود دونوں کے یہاں ایک جیسی فکری اساس ملتی ہے۔

کتاب کے دوسرے باب میں دونوں ناولوں کے موضوعات سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں دونوں ناولوں کے فکر و موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان میں پائی جانے والی مماثلت و تضاد کے پہلو کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دونوں کے یہاں ایک محدود دائرۂ فکر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں چند اہم مشرقی و مغربی ناقدین کی آرا بھی پیش کی گئی ہیں۔ جین آسٹین کے ناول کے حوالے سے یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ حسن و عشق اور شادی بیاہ کے مسائل ہی ان کی کل تخلیقی کائنات ہے۔ ان کی اسی تخلیقی انفرادیت اور دلکشی کے پیش نظر William Somerset Maugham جیسا مغربی نقاد یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ "Pride and Prejudice as one of the ten best novels of the world" عصمت چغتائی کے موضوعات بھی ایک خاص طرح کے ماحول و معاشرے سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس طرح مصنف نے دونوں کے یہاں پائی جانے والی اس فکری یکسانیت کو تحقیقی و تجزیاتی انداز میں قلم بند کیا ہے۔

آخری باب دونوں ناولوں کے فن اور تکنیک کا احاطہ کرتا ہے۔ مصنف نے ان ناولوں میں پائی جانے والی فنی مماثلت اور افتراق کے چند پہلو کو بھی اجاگر کیے ہیں۔ انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دونوں خواتین فکشن نگاروں نے موضوع کی مناسبت سے زبان اور اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ جین آسٹین نے پلاٹ کی ارتقا میں خطوط کا سہارا لیا ہے۔ اس تکنیک کے پیش نظر مصنف نے اسے Epistolary Novel قرار دیا ہے۔ کردار کی پیش کش میں انھوں نے ڈرامائی انداز اختیار کیا ہے۔ عصمت کے یہاں یہ خوبی نہیں ملتی۔ انھوں نے کردار کی پیش کش کے حوالے سے بتایا ہے کہ دونوں ناولوں میں کرداروں کی خاصی تعداد ہے۔ اس لیے دونوں ناولوں کو کرداری ناول بھی کہا جاسکتا ہے۔

ادب کے میدان میں تقابلی مطالعے کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ عہد حاضر میں تقابلی مطالعہ، علم و ادب کے ایک الگ شعبے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ محبوب حسن صاحب نے عصمت چغتائی اور جین آسٹین کا تقابل پیش کرکے ایک نئی پیش رفت کی ہے۔ اردو اور انگریزی ادب کے حوالے سے ان کی یہ تحقیقی کاوش ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ کتاب کی اشاعت پر انھیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد...! امید ہے کہ ان کی یہ کوشش ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

● ● ●

نام کتاب : برہان پور میں اردو نثر نگاری (ماضی اور حال کے آئینے میں)
مؤلف : پروفیسر وسیم افتخار انصاری
ضخامت : ۱۴۳ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتہ : رشید بک ڈپو، منڈی بازار برہان پور
تبصرہ نگار : ایم رحمٰن (دہلی)
mrahmandelhi@yahoo.com

مصنف نے 'انتساب' سے اپنی بات اس طرح شروع کی ہے: "والد صدیق اکبر اور والدین افضال احمد، سعیدہ فرحت کے نام جن کی دعائیں اور شفقتیں ساون بھادوں کی طرح برستی رہتی ہیں"۔

انتساب میں اعتراف ہے، حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی گئی ہے۔ کوئی بھی شخص یوں ہی کمال کے درجے کو نہیں پہنچتا ہے، کوئی نہ کوئی اسے تقویت پہنچاتا ہے، اسے Stimulate کرتا ہے جو اس کی شناخت قائم کرنے میں معاون بن جاتا ہے۔

درحقیقت کتاب کے مصنف پروفیسر وسیم انصاری نے برہان پور میں علمی، ثقافتی اور تہذیبی رشتوں کے بقا کے لیے بے پناہ محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے، جسے اردو ادب کے متوالے فراموش نہیں کرسکتے۔

مصنف نے کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ برہان پور کی صحیح اور سچی تاریخ اہل ادب اور ریسرچ کے طلبہ کے سامنے آجائے۔ باب اول: 'برہان پور کی سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا جائزہ'۔ باب دوم: 'برہان پور کی شعری و ادبی تاریخ کا جائزہ'۔ باب سوم: 'برہان پور میں اردو نثر کا آغاز آزادی سے قبل'۔ باب چہارم: 'برہان پور میں اردو نثر۔ ۱۹۴۷ء سے دور حاضر تک کے اہم نثر نگار' مثلاً صدیق اکبر، اختر پرویز، ایڈووکیٹ سراج انصاری، محمد اطہر عرف بچو میاں، ڈاکٹر سید شرف الدین پیرزادہ، ایڈووکیٹ خلیل احمد انصاری، ڈاکٹر زبیر احمد انصاری، بشیر احمد روشن، ڈاکٹر سید فاروق احمد راحیل وغیرہ۔

پروفیسر وسیم افتخار انصاری کا یہ تحقیقی مقالہ ہے۔ ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ جو بھی ادیب پانچ برس تک برہان پور میں رہ کر تخلیقی کام کیے ہیں انھیں بھی موصوف نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔

اسرار اللہ انصاری (اسسٹنٹ پروفیسر ماکھن لال چترویدی گورنمنٹ گرلس کالج، کھنڈوہ، ایم پی) نے 'برہان پور میں اردو نثری نگاری پر ایک نظر' کے عنوان سے کتاب کی اہمیت و افادیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ راقم ایک اقتباس کا ہی حوالہ دے رہا ہے جس سے کتاب کی مقصدیت کا اندازہ ہوسکتا ہے:

"مقالہ نگار پروفیسر وسیم افتخار انصاری نے جس انداز سے برہان پور کی جغرافیائی صورت حال، محل وقوع، وجہ تسمیہ وغیرہ تحریر کی ہے، نیز معاشی، کاروباری اور اقتصادی حالات پر روشنی ڈالی ہے اس سے تاریخ میں برہان پور کی اہمیت و عظمت واضح ہوجاتی ہے اور اس علاقے سے ناواقف اشخاص کو اس

شہر کی علمی، ادبی اور تاریخی عظمت کا احساس ہو جاتا ہے"۔

پروفیسر وسیم افتخار انصاری کے لیے معروف شاعر عرفان صدیقی کا یہ ایک شعر فن کار کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے:

میں اپنی کھوئی ہوئی لوح کی تلاش میں ہوں
کوئی طلسم مجھے چار سو پکارتا ہے

کتاب پر مقدمہ پروفیسر وسیم افتخار انصاری نے تیس صفحات کا لکھا ہے جس میں انھوں نے نثری ادب کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ پیش لفظ میں ستار انور رقم طراز ہیں:

"برہان پور کو اگرچہ علمی و ادبی، سیاسی اور تمدنی اعتبار سے ہر عہد میں سرگزیت حاصل رہی ہے لیکن اہل دانش کی نگاہیں اس طرف بھی مبذول نہیں ہوئیں جس کے سبب خصوصاً اردو نثر نگاری ادب پر وقت کی گرد جمتی رہی۔ چناں چہ ہمیشہ یہ شہر عوام و خواص کی نظروں سے دور رہا۔ اس کمی کا احساس ہی اس مقالے کی تحریک کا سبب بنا"۔

سچ تو یہ ہے کہ پروفیسر وسیم افتخار انصاری نے بدلتے مناظر میں جس طرح سے حوصلے سے کام لیا ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ یہ موصوف کی فکری و علمی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ شرطِ وفا تو یہ ہے کہ اس کتاب کو خرید کر پڑھا جائے جہاں بے شمار علم کے علمبرداروں کا ذکر خاص ہے۔ توقع ہے کہ ادبی دنیا میں اس کتاب کی پذیرائی کی جائے گی۔

●●●

بقیہ: امارو

صفحہ ۲ سے آگے

سے اس کے تعلقات بہت وسیع تھے، جن میں سے بعض کے نام بھی اس نے اپنی نظموں میں لیے ہیں۔ لیکن امارو کا ہمیں صرف نام ہی معلوم ہے اور سو سے اوپر کچھ نظمیں، اس کی زندگی کے متعلق ہمیں کوئی بات معلوم نہیں۔ البتہ ایک روایت ہے کہ وہ روح جو امارو کے جسم میں تھی اپنے پچھلے سو جنموں میں عورت کے جسم میں ظاہر ہوئی تھی۔ اس ناقابل قبول روایت کی بھی ایک وجہ ہے، امارو کی نظموں کے معتدبہ حصے میں عورت کے جذبات محبت کو اس سلیقے، نفاست اور عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ کسی مرد سے وہ ممکن ہی نہیں تا وقتیکہ اس میں کافی حد تک نسائیت کا عنصر موجود نہ ہو۔ ایک روایت کے مطابق امارو کی نظموں کو شنکر آچاریہ کے نام لگایا جاتا ہے جب کہ اس نے راجا امارو کے مردہ جسم میں جان ڈالی کہ وہ منڈنا مصر کی بیوی سے کسی موضوع پر مباحثہ کر سکے۔ روایت ہی کے طور پر امارو کو بکرماجیت کے رتنوں میں سے بھی بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ کالی داس کا ہم عصر ہو۔ مختلف کتب کی اندرونی شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ امارو وردھمن سے پہلے ہوا، اس لیے اس کا زمانہ ۸۰۰ ق م کے بعد تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بکرماجیت کا دور ۳۸۰ء سے ۴۱۳ء تک ہے، لیکن اگر بکرماجیت کے زمانے میں امارو کی شاعری تخلیق پائی تو ہمیں بکرماجیت کے اور رتنوں کی طرح اس کے حالات بھی معلوم ہو سکتے۔ 'امارو شتک' یعنی 'امارو کی سو نظمیں' میں ایک نظم ایسی بھی ہے جس کے شروع میں ایک وضاحتی کلمہ ہے: "یہ بدھ کی بیوی کی پرارتھنا ہے"۔ اس سے ہمیں ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ امارو کا زمانہ بدھ کے بعد کا ہے۔ گویا پرکار کے نصف قطر کو گھماتے ہوئے ہم امارو کے زمانے کو ۴۸۳ ق م اور ۳۸۰ بعد مسیح کے درمیانی حصے میں محدود کر سکتے ہیں۔

'امارو شتک' یا امارو کی سو نظموں کو ہندستان بلکہ دنیا کی عشقیہ شاعری میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ امارو کی شاعری نے سنسکرت ادب میں پہلی بار اس حقیقت کو منوایا کہ صرف محبت ہی کو شاعری کا بنیادی موضوع بنا کر گوناگوں نغمے چھیڑے جا سکتے ہیں، نیز امارو کی شاعری ہی سے محبت کی غزلیہ نظموں نے باقاعدہ بند کی ہیئت اختیار کی۔ ایک بند کی محدود وسعت میں محبت کے کسی احساس کو مکمل طور پر بیان کرنا اس شاعری کا مقصد ہے، لیکن احساسات کی ایسی نقاشی کوئی آسان کام نہیں ہے، کیوں کہ اس میں چند مختصر لفظوں اور چند بے تلے فقروں میں ایک احساس کی شدت اور ایک جذبے کی تاثر کی ترجمانی کرنا ہوتی ہے، لیکن آج کل کی شاعری میں جو تجزیاتی عنصر ہے وہ اس میں موجود نہیں ہوتا۔ گویا یوں کہیے کہ اس نغمے میں ہر ماترے کو علاحدہ نہیں کر دیا جاتا بلکہ ناپ تول کے باوجود ان کی باہمی آمیزش اس طور پر رنگی جاتی ہے کہ ذہن کو وہی لذت حاصل ہو جو کسی راگ سے لبریز دامن کو سننے سے ہوتی ہے، یعنی اس نغمے میں سرگم کی بے کلی نہیں ہوتی۔

(باقی آئندہ)

●●●

بقیہ: دارا شکوہ کا دربار

صفحہ ۸ سے آگے

سے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دور نہ کر دیا ہوتا۔ یونان کی تاریخ ان قربانیوں سے بھری پڑی ہے جو یونانیوں نے دوسروں کو مہذب بنانے کے لیے کیں۔ اطالیہ کی فتوحات نے دنیا پر وہ احسان کیا جس کو وہ ابد تک کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ جس نے دنیا کی نجات کا دروازہ کھول دیا۔ حضرات! وہ کون سا احسان ہے؟ وہ یہ ہے کہ اطالیہ نے مسیح کے مشن کو ساری دنیا میں پھیلایا، مسیحی روشنی سے کفر کی تاریکی کو دور کیا۔ اٹلی ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے روحانی تشنگی کو بجھانے والا پانی نکلا۔

جہاں پناہ! کون کہتا ہے کہ اٹلی کا نام و نشان مٹ گیا؟ کون کہتا ہے کہ اطالیہ کی سلطنت نیست و نابود ہو گئی۔ آج کی دنیا ایک بڑی اٹلی ہے اور دنیا کی تمام سلطنتیں اٹلی کا نام روشن کر رہی ہیں۔ اگر ۲۰۰۰ء میں اطالیہ کی بادشاہت انتہائے عروج پر پہنچی ہوئی تھی تو آج فلک چہارم تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہر ایک قوم کا تمدن، اخلاق و آداب، واصول سلطنت جو آج دنیا میں رائج ہیں، اٹلی ہی کی ٹکسال سے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ حتیٰ کہ یونان کا ہم پر جو اثر پڑا ہے وہ بھی اٹلی ہی کا طفیل ہے۔ آج لاطینی جو اطالیہ کی زبان ہے، دنیا کی مہذب اقوام کی پاک زبان ہے۔

ایشیا میں خدا نے ہند کو علم و تہذیب کا خزانچی بنایا ہے اور اب کچھ دنوں سے مسیحی انمول جواہرات بھی اس کو سپرد کیے جانے لگے ہیں۔ پس اس کا فرض ہے کہ دوسری ایشیائی قوموں کو اپنی دولت سے فیض بخشے۔ دل کھول کر اس خزانے کو صرف کرے، سیر چشمی دکھائے، فیاضی کا ثبوت دے۔ اگر اس بے انتہا دولت سے خود فائدہ اٹھائے گا تو خود غرض کہلائے گا۔ آنے والی نسلیں اس پر بخل کا الزام لگائیں گی۔ اگر وہ تہذیب کا پیالہ خود پیے گا اور دوسری قوموں کو اس سے محظوظ نہ ہونے دے گا تو اس پر شکم پروری کا الزام لگایا جائے گا پس اس کا فرض ہے کہ قندھار کو یہ پیالہ پلائے اور دل میں سمجھے کہ وہ خدا کی طرف سے اس کام کو کرنے کے لیے تعینات ہوا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ قندھار آسانی سے یہ پیالہ نہیں پیے گا، مگر اس کا باعث یہ ہے کہ وہ اس کی لذت کو نہیں جانتا۔ اس کے فوائد سے بے علم ہے۔ اب ہند کا فرض ہے کہ اس کو اس کا مزہ چکھائے، اس کے فوائد ذہن نشین کرے"۔

پادری جوزربیٹ نے مشکل سے اپنی تقریر ختم کی تھی کہ شہزادہ والا جاہ نے تخت سے اتر کر ان سے ہاتھ ملایا۔ ڈاکٹر برنیر کا چہرہ جوش مسرت سے کھل اٹھا مگر ہنری بوزے صاحب کا چہرہ مدھم پڑ گیا کیوں کہ ان پر صاف ظاہر ہو گیا کہ اب میری صلاح کے منظور کیے جانے کی ذرا بھی امید باقی نہیں۔ پادری صاحب کا کیا پوچھنا، وہ تو سمجھتے تھے آج جنگ جیت لیا اور کیوں نہ سمجھتے ابھی تک مہم قندھار پر کسی نے اس پہلو سے بحث نہیں کی تھی۔ یہ پادری صاحب کی ہی سوجھ بوجھ ہے۔

اس تقریر کے بعد کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ آخر شہزادہ صاحب نے یوں فرمایا: "حضرات! میں آپ کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی دانشمندانہ تقریروں سے مجھ کو مسرور کیا۔ جس وقت میں نے اس دیوان خاص میں قدم رکھا تھا، میں مہم قندھار کے بالکل برخلاف تھا۔ متواتر دو شکستوں نے میرے حوصلے پست کر دیے تھے اور مجھے فطرتاً یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے ہمارے جوش تغلب کی سزائیں دی ہے، مگر ڈاکٹر برنیر و پادری جوزربیٹ کی پُراثر تقریروں نے میرے خیالات کی کایا پلٹ کر دی اور میرا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ حتی الوسع قندھار کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ میں قندھار کو ہندستان کا ایک صوبہ بنا دوں گا اور یہ کوئی نئی بات نہیں، سنسکرت کتابیں شاہد ہیں کہ زمانۂ قدیم میں جب کہ آریوں کا ستارہ عروج پر تھا، قندھار ہند کا ایک صوبہ تھا۔ دونوں ملکوں کے فرمانرواؤں میں شادیاں ہوتی تھیں۔ راجہ دھرت راشٹر کی بیوی گاندھاری راجہ قندھار کی لڑکی تھی۔ دونوں بھائیوں میں اب ذرا سرد مہری آ گئی ہے، مگر میں از سر نو ان کو گلے ملاؤں گا"۔

اس تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ ("آزاد" ستمبر ۱۹۰۸ء)

●●●

بقیہ: مظہر امام: ایک مطالعہ

صفحہ ۳ سے آگے

کا اشاریہ ہے۔ اس کتاب سے بھی مظہر امام کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کی بھرپور تصویر سامنے آتی ہے۔ کتاب کے آغاز میں 'آزاد غزل پر ایک نوٹ' کے عنوان سے ایک مضمون ملتا ہے جو آزاد غزل کی افہام و تفہیم نیز اس کی تاریخ اور لوازمات کے بارے میں پوری اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ پابند غزل، آزاد غزل سے کس طرح مختلف ہے، مظہر امام کا یہ مضمون اس بات کا بھی پوری طرح محاسبہ کرتا ہے۔ اس کے بعد آزاد غزل گو شعرا کی فہرست بھی ملتی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ آزاد غزل گو شعرا میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

مظہر امام کے تنقیدی و تحقیقی مضامین بہت دل چسپ ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نہایت ہی خلوص و انہماک اور محنت اور لگن سے شعر و نثر کے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی زبان سلیس اور سادہ ہے اور اسلوب بھی دلکش ہے۔ اُن کا لہجہ کبھی کبھی طنزیہ بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ طنز اپنا ایک الگ وقار رکھتا ہے۔ مظہر امام کی تنقید نگاری کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ ان کی خامیوں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ کمزوریوں اور فروگزاشتوں کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں برتتے۔ شاعری میں بھی اُن کا طریقۂ کار ایسا ہی رہا ہے۔ وہ تاریخ کو بھی سامنے رکھتے ہیں اور ادوار کا بھی بغور جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد تنقیدی و تحقیقی میزانوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور تہذیبی محرکات و عوامل کی روشنی میں کیفیات کو پرکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

ان تمام باتوں کو ملحوظ نظر رکھ کر اگر یہ کہا جائے کہ مظہر امام نے اردو شعر و ادب کے معاصرین میں اپنی کڑی محنت، مسلسل جستجو اور لگن سے اپنے لیے ایک ممتاز اور منفرد مقام بنایا ہے تو قطعاً بے جا نہ ہوگا۔

●●●

دارا شکوہ کا دربار

دوسری اور آخری قسط

ڈاکٹر برنیر اس وقت خیالات کے دریا میں غرق تھے۔ انھوں نے ہنری بوزے کے اعتراضوں کی تردید کرنے کے لیے چند نوٹ لکھے تھے۔ ان کے چہرے سے جوش یا بے صبری ذرا بھی نہ ظاہر ہوتی تھی۔ لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں اب یہ کیا جواب دیتے ہیں۔ آخر کئی منٹ کے بعد کے بعد بولے "حضرات! مجھے کمال افسوس ہے کہ اس وقت مجھے چند نامرغوب سچائیوں کا اظہار کرنا پڑتا ہے، مگر چوں کہ سچائیاں بہت کم مرغوب ہوتی ہیں امید ہے کہ آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں گے۔ میرے مشفق قدردان ہنری بوزے صاحب نے فرمایا کہ حکومت کا قیام و دوام اخلاقی اثرات پر مبنی ہے نہ کہ طبعی اثرات پر جس کے یہ معنی ہیں کہ "اے شاہان روئے زمین یہ عرب و ضرب کس لیے؟ یہ جنگ و جدال کس لیے یہ پیدل و سوار کس لیے۔ ان کو جہنم میں پھینکیے، چند خدا پرست، حق تقدس مآب بزرگوں سے فرمائیے کہ شارع عام پر کھڑے ہو کر وعظ کیا کریں بس باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ پھر دیکھیے تو کیسے زمانے کی حکومت چلتی ہے"۔ تعجب ہے کہ مسٹر بوزے صاحب باوجود وسیع التجربہ ہونے کے ایسی فاش غلطی میں پڑ گئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو اصول انھوں نے بیان کیا وہ غلط ہے، ہرگز نہیں وہ بہت صحیح ہے مگر اصولوں کی درستی اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ عملاً تمام ضروریات کو رفع کر سکتی ہیں۔ شاید صاحب موصوف جمہور اٹوپیا (Utopia) کا خواب دیکھ رہے تھے وہ بھول گئے تھے کہ اٹوپیا کا وجود خواب ہی تک محدود ہے اور یہاں اس کا ذکر کرنا لاحاصل ہے۔ میں مسٹر بوزے سے پوچھتا ہوں کہ خدا نے نیکی کے ساتھ بدی بھی پیدا کی تھی۔ ان کا جواب ہوگا نہیں۔ خدا نے نیکی پیدا کی، نیکی کی غیر موجودگی بدی ہے باوجود اس کے چو طرف دیکھیے بدی ہی کی گرم بازاری ہے۔ نیکی اور بدی میں پہلی لڑائی جو باغ عدن میں ہوئی اس میں بھی میدان بدی ہی کے ہاتھ رہا۔ دنیا میں مشعل لے کر ڈھونڈیے تب بھی مشکل سے اچھے نیک آدمی ملیں گے جو ایک شہر آباد کر سکیں۔ ساری دنیا بدی سے بھری ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی حکومت قائم رہ سکے تاوقتیکہ وہ سرکشوں، مفسدوں، باغیوں، ظالموں کی سرکوبی کے لیے ہمیشہ آمادہ نہ رہے۔ ہماری خدا سے دعا ہے کہ مسٹر بوزے کسی ملک کے بادشاہ ہوں اور وہ اپنے اصولوں پر عمل کر کے تمام دنیا کو سبق دیں کہ حکومت اخلاقی اثرات پر کیوں کر قائم رہتی ہے۔

جہاں پناہ! کون نہیں جانتا کہ بنی نوع انسان کے فرائض جدا جدا ہیں۔ باپ کا فرض بیٹے کے فرض سے جدا ہے۔ باپ کا فرض بیٹے کی تعلیم و تربیت، خورش و پوشش اور دیگر ضروریات کا مہیا کرنا اور بیٹے کا فرض ہے کہ والدین کی اطاعت و فرماں برداری کرتا۔ بادشاہ کا فرض عوام کے فرض سے بالکل جدا ہے۔ رعایا پروری و معدلت گستری بادشاہوں کے اعلا ترین فرائض ہیں اور اطاعت و شکر گزاری رعایا کے۔ اگر باپ اپنے بیٹے کو مارے کوئی اس کو برا نہیں کہہ سکتا، مگر بیٹے کا باپ کی شان میں ایک سخت کلمہ بھی نکالنا کفر ہے۔ اگر عام افراد بلا اجازت ایک دوسرے کی چیزیں لیویں تو اس کو سرقہ یا رہزنی کہیں گے۔ مگر ایک بادشاہ کا بغرض ملک گیری دوسرے بادشاہ پر حملہ کرنا ہرگز ہرگز ناجائز نہیں۔ توسیع مملکت تو بادشاہوں کا سب سے اہم فرض ہے کہ رعایا پروری اس کا ایک خاص جزو ہے۔ توسیع مملکت سے تجارت کو فروغ ہوتا ہے، صنعت کو ترقی ہوتی ہے، رعایا کا جوش قومی بڑھتا ہے، حب الوطنی پیدا ہوتی ہے، اپنی قوم کے کارناموں پر ناز ہوتا ہے، کیا یہ سب اہم اور مفید نتائج نہیں ہیں۔ دول قدیمہ کی بربادی کو توسیع مملکت سے منسوب کرنا دانش مندی کے خلاف ہے۔ روم و ایران و یونان کا نام اس وجہ سے نہیں مٹا کہ انھوں نے اپنے مقبوضات کو وسعت دی بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں کاہلی، بزدلی، آرام طلبی، نفس پرستی اور بداعمالی کا زور ہو گیا۔ وہ فطرت کے اس قانون سے متاثر ہوئے جس کو انتخاب فطرت کہتے ہیں۔ آغاز دنیا سے تمام جانداروں میں وہ کھینچا تانی، وہ کشمکش مچی ہوئی ہے جس کو مصارف ہستی کہیں تو نازیبا نہ ہوگا۔ اس میں زبردستوں کو فتح ہوتی ہے اور جو نحیف و ناتواں ہیں وہ شکست پاتے ہیں اور ان کا نام ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے نقش باطل کی طرح مٹ جاتا ہے۔ اس قانون کا اثر انسان و حیوان سب پر یکساں پڑتا ہے۔ جانوروں کی صدہا قسمیں معدوم ہو گئیں اور صدہا بڑی بڑی قومیں بے نام و نشان، کیوں کہ ایک خاص مدت کے بعد ہر ایک قوم میں وہ عوارض پیدا ہو جاتے ہیں جو دولت و ثروت و حشمت و شوکت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ علاوہ اس کے زمانے کی رفتار ترقی پر ہے اور جب کوئی قوم ایک مدت دراز تک قائم رہتی ہے تو اس میں بے اختیاری طور پر قدامت کی بو آنے لگتی ہے اور چوں کہ اسلاف پرستی ایک خاصہ انسانی ہے۔ یہ قوم اپنے رسم و رواج، تمدن و طرز معاشرت میں ایسی ترمیمیں نہیں کر سکتی جو موجودہ زمانے کے موافق ہوں۔ آخر نئی قومیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جن کا جوش تازہ ہوتا ہے۔ پرانی قومیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ کیا مسٹر بوزے کا یہ منشا ہے کہ ہندستان اس مصارف ہستی سے منہ پھیرے اور بزدل گنا جائے اور دوسری نئی قوموں کا شکار بنے؟ دیکھیے آج کے دن یوروپ میں یہ زندہ رہنے کی لڑائی کیسے سرگرمی سے لڑی جا رہی ہے۔ کون ایسی سلطنت ہے جو اپنے حدود سے باہر پاؤں پھیلانے کے لیے دل و جان سے کوشش نہیں کر رہی ہے۔ جہاز چلائے جا رہے ہیں، ان پر ہزاروں میل کا خطرناک سفر طے کیا جا رہا ہے۔ روپیہ کوڑیوں کی طرح پھونکا جا رہا ہے اور آدمیوں کی جانیں نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کی جا رہی ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ نوآبادیاں قائم کی جائیں، ملک کی تجارت کو وسعت ہو، دولت میں افزونی ہو اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے جگہ نکلے۔ دو صدیوں میں فرانس کی آبادی چوگنی ہو جائے گی، اس کے لیے معیشت کا کیا سامان ہوگا، اگر ابھی سے پیش بندیاں نہ کی جائیں گی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہندستان کو فی الحال تنگی محسوس ہو رہی ہے۔ نہیں، ابھی بہت سے وسیع خطے بالکل غیر آباد ہیں۔ مگر جلد یا دیر میں یہاں بھی تنگی ضرور بالضرور محسوس ہوگی۔ آبادی کی افزونی ایک فطری قانون ہے۔ اس کو کوئی روک نہیں سکتا، کیوں نہ ہندستان یوروپی اقوام کی تقلید کرے اور ابھی سے آئندہ کے لیے کوشش کرے۔ آنے والا زمانہ موجودہ زمانے سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے"۔

پریم چند

جس وقت ڈاکٹر برنیر اپنی جگہ پر بیٹھے کہ اہل مجلس نے تعریفوں کی بوچھاڑ کر دی۔ خصوصاً شہزادہ صاحب کو ان کی تقریر نہایت پسند آئی۔ فوراً تخت سے اتر کر اس نے ہاتھ ملایا۔ ہنری بوزے صاحب دل ہی دل میں کٹے جا رہے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر برنیر کی توقیر میری در پردہ توہین ہے، کیوں کہ ڈاکٹر صاحب ان سے بہت کم اختلاف کیا کرتے تھے اور اگر کرتے بھی تھے تو منہ کی کھاتے تھے، مگر اس وقت پالا انھی کے ہاتھ رہا۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد بھی جب ہنری بوزے صاحب جگہ سے نہ ہلے تو پادری جوزبٹ نے یوں در افشانی کی:

"حضرات! میری دانست میں مہذب اقوام کا فتوحات سے ہرگز یہ منشا نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے ہی ملک کا فائدہ سوچیں۔ اپنے ہی ملک کو دولت سے مالا مال و نہال کریں اور محض اپنی ہی مطلب براریوں کے لیے غیر قوموں کے گلے میں فرماں برداری کا طوق پہنائیں، بلکہ ان فتوحات سے مفتوح قوموں کا فائدہ مدنظر ہونا چاہیے۔ یونان کے فتوحات نے یونان کی صرف شہرت نہیں بڑھائی بلکہ اس کی مفتوح قوموں میں علم و تہذیب، صنعت و حرفت و فنون لطیفہ کی بنیاد ڈالی۔ سارا یورپ نہیں بلکہ ساری دنیا نے یونان ہی کے مدرسہ تہذیب میں تعلیم پائی ہے۔ یونان نے پہلے پہل دنیا کو اصول سیاست سکھائے، فلسفہ اور منطق، علم عروض و کیمیا، علم علاج و علم موسیقی سب اسی یونانی ذہن کے کرشمے ہیں۔ آج یوروپ میں یہ آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی کہاں ہوتی، اگر یونان نے اپنی تہذیب کو آغاز نما مشعل

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org